ڈاکٹر الطاف انجم
اسسٹنٹ پروفیسر، نظامت فاصلاتی تعلیم، سری نگر، کشمیر، انڈیا

اردو میں تھیوری کا مستقبل

Dr Altaf Anjum

Assistant Professor, Directorate of Distant Learning, Sirinagar, Kashmir, India

Future of 'Theory' in Urdu

Future of Theory in Urdu is directly associated with the history of the theoretical criticism in Urdu which has been significantly influenced by Western trends. The early traces of tradition of 'theory' in Urdu literature can be found in Ali Gargh movement. With the passage of time, new trends emerged and new theories were introduced in Urdu literature and criticism. The article analytically discusses the contemporary situation and future of 'theory' in Urdu literature in the context of post modern era.

اُردو میں تھیوری کا مستقبل، اُردو کی نظریاتی تنقید کی تاریخ کے مغرب آمیز وجود سے مشروط ہے۔ اگر اُردو تنقید کے نظریاتی سرمایے سے مغربی رویّوں اور رجحانات کو منہا کیا جائے تو اس کا چہرہ کتنا پُرضعف، کم مایہ، شکست خوردہ اور بے کیف نظر آئے گا اور اس کا وجود ایک بار پھر عروض، بیان اور بدیع کی اسی تثلیث سے عبارت قرار دیا جائے گا جس کے خلاف کلیم الدین احمد نے اسے معشوق کی کمر سے موہوم اور اقلیدس کے فرضی نقطے سے بھی مصغر قرار دیا تھا۔ اسی طرح حالؔی نے بھی اپنا احتجاج درج کر کے مشورہ دیا تھا کہ ؎

حالی اب آؤ پیروئ مغربی کریں
بس اقتدائے مصحفی و میرؔ کر چکے

بنیادی طور پر اُردو تنقید میں تھیوری سازی کا عمل سرسید تحریک کے زیر اثر شروع ہوا۔ مولانا الطاف حسین حالؔی، شبلی نعمانؔی، محمد حسین آزاد اور امداد امام اثرؔ نے اسے اُردو میں بطور صنف رائج کرانے میں شعوری اور غیر شعوری طور پر اپنی بساط بھر کوشش کیں۔ جب ان ادیبوں نے تنقید کے میدان میں اُتر کر لوح و قلم سنبھالے تو سامنے ''مغربی کلامیے'' اپنی تمام تر چکا چوند کے ساتھ موجود تھے۔ یہ نوآبادیاتی دور تھا جس میں فاتح نے اپنے مفتوح کے لیے اپنے معاشی اور سیاسی استحکام اور جبر و استبداد کے ہتھکنڈوں کو موثر و مضبوط بنانے کے لیے نظامِ تعلیم سے لے کر سماجی، سیاسی اور علمی آئڈیالوجی کا نصاب پڑھانا شروع

کر دیا تھا۔ان حالات میں جب اُردو سے وابستہ ناقدین نے تنقیدی عمارت کی بنیاد ڈالی تو مغرب کے نظریات وتصورات سے اخذ واستفادہ ان کے لیے کسی اور چیز سے بھی زیادہ ضروری تھا۔ ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک نے مارکسزم کی ایک خاص شکل کے تحت نیا ماڈل پیش کر کے تاریخی ،سیاسی اور مادّی عناصر کے تجزیے کو ادب شناسی کے لیے لازمی گردانا۔اس طرح ایک بار پھر اُردو تنقید کی مشاطگی میں مغربی افکار کے سامانِ آرائش وزیبائش سے بھرپور استفادہ کیا گیا جس نے اسے مناسب حد تک لائقِ پیش کش بنا دیا۔

اُردو میں نئے تنقیدی تصورات کی نمود کا لامتناہی سلسلہ باضابطہ طور پر جدیدیت کے ساتھ ہی شروع ہوا۔جس میں نئی تنقید، ہیئتی تنقید اور ساختیاتی تنقید جیسی تھیوریز سامنے آئیں۔یہ تینوں نظریاتِ نقد اُردو کی روایتی تنقید کے خلاف پہلا باضابطہ قدم تھا جس نے ادب پارے کے خود مکتفی اور خود مختار وجود کا اعلان کر کے اس سے اس کے سوانحی ،تاریخی ،نفسیاتی ،عمرانی اور سماجی انسلاکات سے نجات دلا دی اور یہی وہ دور ہے جب پہلی بار اُردو تنقید میں مصنف کی مرکزی حیثیت کو معرضِ سوال میں کھڑا کیا گیا۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی میں مابعد جدید ثقافتی صورتِ حال نے تخلیق کاروں کو نہایت حد تک متاثر کر دیا۔جس کے نتیجے میں اِن میں مابعد جدید صورتِ حال کے عناصر کا اثر محسوس اور نامحسوس طور پر دکھائی دیتا ہے۔اب جب کہ ادبی تخلیقات نئی اور تغیر پذیر صورتِ حال سے دوچار ہوئیں تو اِن کے تعینِ قدر کے لیے مابعد جدید تھیوریز سامنے آئیں جنھوں نے اُردو کو نئی تنقیدی زبان ،اصطلاحات اور اسالیب تفویض کر کے اس آب جو کو بحرِ بیکراں میں متشکل کر دیا۔اس طرح جو تنقیدی نظریات سامنے آئے ان میں پس ساختیاتی تنقید، نئی تاریخیت ، بین المتونیت، نو مارکسیت ، قاری اساس تنقید، تانیثی تنقید، اکتشافی تنقید، امتزاجی تنقید، مابعد نو آبادیاتی تنقید کا ذکر بطورِ خاص کیا جا رہا ہے۔ان نظریات کی تشریح وتوضیح سے لے کر ان کے اطلاق تک اُردو کے معدودے چند ناقدین نے ہی آگے بڑھ کر اپنی ادب فہمی اور نئے نظریات کے تئیں اپنی فکری وابستگی کا مظاہرہ کیا۔ان ناقدین میں گوپی چند نارنگ، وزیر آغا، وہاب اشرفی، قمر جمیل، ابوالکلام قاسمی، ضمیر علی بدایونی، حامدی کاشمیری، قاضی افضال حسین، عتیق اللہ، نظام صدیقی، ظہور الدین، قدوس جاوید وغیرہ ہراول دستے میں شامل رہے۔انہوں نے مابعد جدید صورتِ حال اور تھیوری پر نہایت ہی عالمانہ نوعیت کے مضامین لکھ کر عالمی سطح پر رونما ہو رہی ثقافتی، سیاسی، علمی اور ادبی تبدیلیوں سے ہم آہنگ کرنے کی مستحسن کوششیں کیں۔

تھیوری کی موجودہ صورتِ حال اور مستقبل پر گفتگو آگے بڑھانے سے پہلے یہاں پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مابعد جدید صورتِ حال اور مابعد جدید تھیوری کے مابین امتیاز وافتراق کو واضح کیا جائے تاکہ موضوع کی تفہیم میں کسی قسم کا بُعد یا دشواری سامنے نہ آئے۔یہاں پر یہ بتانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مابعد جدیدیت کی کوئی متعینہ تعریف وتوضیح اس کے اپنے سماجی، سیاسی، عمرانی، لسانی، ادبی، ثقافتی اور علمی مسائل وانکشافات کے زائیدہ تکثیری مزاج کی وجہ سے ممکن نہیں ہے تاہم اس کو عصر حاضر کی ثقافتی صورتِ حال سے تعبیر کیا جا رہا ہے۔اس کی تعریف وتوضیح کے ضمن میں جتنی بھی تحریریں سامنے آ چکی ہیں انہوں نے متناقض رویّوں کو ہی جنم دیا ہے جس کی وجہ سے اس کی کوئی واحد یا متفق تعریف ہزاروں صفحات سیاہ کیے جانے کے باوجود بھی سامنے نہیں آ سکی۔ مابعد جدید صورتِ حال بیسویں صدی کے ربع آخر میں ثقافتی سطح پر ادب، آرٹ اور دوسرے تخلیقی مظاہر میں اپنا اثر ونفوذ ظاہر کرنے لگی۔اس طرح جب دوسری زبانوں کے ساتھ ساتھ اُردو میں تخلیق کاروں نے اپنی تخلیقی سرگرمیوں کو پیش کیا تو اُنہوں نے بھی اس کے اثرات کو شعوری یا غیر شعوری طور پر قبول کیا ہے۔اب جیسا کہ کہا گیا ہے کہ ہر دور کا ادب اپنے تنقیدے پیمانے

اور معیارات خود اپنے دور کے سماجی، علمی، ثقافتی اور تہذیبی مقدمات کے تحت متعین کرتا ہے تو اسی کلیے کی رو سے مابعد جدیدیت نے ادب شناسی کے ضمن میں تھیوری پیش کر کے اپنا فرض ادا کیا۔ اس طرح تھیوری نے اُس خلا کو پُر کرنے کی کامیاب کوشش کی جو وجودیت کے زیرِ اثر جدیدیت کے دور میں ادب کو عسیر الفہم، پیچیدہ اور چیستان بنانے کی وجہ سے پیدا ہوا تھا۔

O

تھیوری کے مستقبل کا تعین کرتے وقت پہلے موجودہ زمانے میں اس کے نظریاتی اور بالخصوص اطلاقی نمونوں کی صحت اور عدم صحت پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالنی لازمی ہے تاکہ مستقبل کی شیرازہ بندی کرنے میں کسی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ جب ہم مابعد جدید تنقیدی کلامیوں کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو سب سے پہلے ہمارا سابقہ دو امریکی طالبات باربرا ڈی میٹکاف اور لنڈا وینٹک کی تحریروں سے پڑتا ہے۔ باربرا نے علامہ اقبالؔ کی مشہور نظم ''مسجد قرطبہ'' جب کہ وینٹک نے انور سجاد کے ناول ''خوشیوں کا باغ'' کا تجزیہ ساختیات کی روشنی میں پیش کر کے اُردو میں ساختیاتی طریقۂ تنقید کا باضابطہ آغاز کیا۔ یہ ۱۹۷۷ء کی بات ہے جب امریکہ میں ساختیات اور پس ساختیات پر مباحث زوروں پر تھے۔ اُردو میں محمد حسن عسکری اور ترقی پسند نقاد محمد علی صدیقی اور ان کے کچھ دیر بعد سلیم اختر اور وزیر آغا نے ساختیات پر لکھنا شروع کیا تھا لیکن حق تو یہ ہے کہ اس کے بہت بعد یعنی اسّی کی دہائی میں اُردو ناقدین نے اس کی طرف سنجیدگی کے ساتھ توجہ کی۔ اس دوران گوپی چند نارنگ نے ہندوستان اور پاکستان کے مؤقر رسائل و جرائد میں ساختیات، لاتشکیل، پس ساختیات، مابعد جدید تھیوری پر متواتر مضامین شائع کروائے۔

مابعد جدید تھیوری نے ادب کی تفہیم و تحسین کے جو نئے ماڈل پیش کر کے اُردو میں نئے تنقیدی دور کا آغاز کیا اُن میں پس ساختیاتی تنقید کو کئی اعتبار سے اہمیت حاصل ہے۔

☆ دریدا کے نہایت ہی روایت شکن رویّے پر مبنی پس ساختیاتی تنقید، ساختیات کے ردِعمل میں سامنے آئی۔ اس یعنی پس ساختیاتی تنقید نے لوگومرکزیت (Logocentrism) کے تحت تقریر پر تحریر کے تفوق کی مہر ثبت کر کے متن میں معنی کی موجوگی سے یکسر انکار کر دیا جس سے معنی کو لامرکز کر دیا گیا اور یہ ہمیشہ التوا میں رہا۔ اس نظریے سے معنی کی تکثیریت (Plurality of Meaning) کی راہیں کھلنی لگیں۔

☆ نئی تاریخیت' ادب کے تاریخی مطالعہ پر زور دیتی ہے نہ تاریخی متون میں ادبیت کی تلاش و جستجو کا نام ہے بلکہ یہ ادب اور تاریخ کی ہم رشتگی پر اصرار کرتی ہے۔

☆ بین المتونیت کے تحت ایک مخصوص متن میں مضمر اُن تاریخی، تہذیبی اور ثقافتی متون کو دریافت کیا جاتا ہے جن کی مدد سے یہ متن تخلیق کے مختلف مراحل و منازل طے کرتا ہے۔ اِن ثقافتی متون کے دھاگے اور ریشے ہمارے اجتماعی لاشعور کا ناگزیر حصہ ہوتا ہے جو اس نو تخلیق شدہ متن کی تیاری میں اپنا کردار ادا کرتا ہے۔

☆ نو مارکسیت بیک وقت آرتھوڈاکس مارکسی تنقید کی توسیع بھی ہے اور اس کی تردید بھی۔ جہاں مارکسی تنقید سیاسی اجبار کے تحت ادب پاروں سے تاریخ کے مختلف ادوار میں قائم بورژوازیوں اور پرولیتاریوں کے مابین طبقاتی کشمکش اور پیداواری ذرائع کی غیر متوزن تقسیم کو اپنا موضوع بناتی ہے وہیں نو مارکسیت کارل مارکس کے فلسفیانہ افکار و نظریات سے غیر جانبدارانہ طور پر دانشورانہ مکالمہ قائم کرتی ہے۔ ہر طرح کے آئیڈیالوجیکل جبر سے آزادی ہی اس کا طرۂ امتیاز ہے۔

☆ قاری اساس تنقید مجموعی طور پر ادب کی تحسین و تفہیم میں قاری کی بلا واسطہ شرکت پر مُصر ہے۔ یہ نظریہ مصنف، تاریخ، ثقافت، زبان، زمانہ اور زندگی جیسے تمام انسلاکات سے عاری ہے۔

☆ تانیثی تنقید مابعد جدیدیت کی اہم دین ہے۔ یہ تھیوری تاریخ کے مختلف ادوار میں تخلیق کیے گئے متون میں عورت کی غیر تسلی بخش نمائندگی پر اظہارِ ناراضگی کرتی ہے اور ثقافتی متون کے ازسرِ نو تجزیے پر اصرار کر کے طبقۂ اناث کے اجتماعی عرفانِ نفس اور شعورِ ذات کی بازیافت کی جستجو کرتی ہے۔

☆ اکتشافی تنقید میں نقاد کو جو کام تفویض ہوا ہے وہ یہ ہے کہ اُسے اُس تخیلی تجربے کا اکتشاف کرنا ہے جس سے ایک تخلیق کار ادب پارے کی تخلیق کے دوران دوچار ہوتا ہے۔ یہ تخیلی تجربہ معنی اور موضوعیت سے بالکل مختلف ہے اور اس کو وہی نقاد منکشف کر سکتا ہے جو تخلیق کے پراسرار مراحل سے واقفیت رکھتا ہو۔

☆ امتزاجی تنقید ادب پارے کی تنقید میں اسی تنقیدی نظریے کو کام میں لانے کی داعی ہے جس سے اس کی معنوی جہتیں کھل سکیں۔ یہ جملہ نظریاتِ نقد کا حاصلِ جمع نہیں ہے بلکہ ادب شناسی کا ایک منفرد اور ممتاز طور ہے جسے عصرِ حاضر میں کئی ناقدین نے غیر شعوری طور پر ادب فہمی کے تفاعل کے دوران برتا ہے۔

☆ مابعد نوآبادیاتی تنقید بنیادی طور پر ادب پاروں کی تنقید کے دوران نوآبادیاتی دور کے حاوی کلامیوں کا تجزیاتی مطالعہ پیش کرتی ہے جس سے یہ پتہ لگانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ سیاسی اور معاشی، علمی اور ادبی منظرنامے پر کس نوعیت کا نوآبادیاتی جبر حاوی رہا ہے جو ازسرِ نو تاریخ مرتب کرنے میں مدد فراہم کرتی ہے۔

مذکورہ بالا نظریات کی تفہیم و توضیح میں اُردو کے صفِ اول کے ناقدین نے بڑھ کر حصہ لیا اور برصغیر کے معتبر اور موقر رسائل و جرائد میں اپنے مضامین کو منصۂ شہود پر لایا گیا لیکن اُن سے تقاضا کیا گیا کہ اِن نظریات کے اطلاقی نمونے پیش کیے جائیں اور اس طرح انہوں نے مابعد جدید تھیوری کی فہم و فراست کا ثبوت پیش کر کے تخلیقات کے تجزیاتی مطالعے پیش کیے۔ اس ضمن میں جو اطلاقی نمونے سامنے آئے انھیں تھیوری کی کامیابی پر ہی محمول کیا جاتا ہے۔ یہاں پر اطلاقی کے نام پیش کیے جا رہے ہیں مثلاً 'فیض کو کیسے نہ پڑھیں'، 'کیا تنقید کی بدلتی ترجیحات اور رویّے ہمیشہ نظریاتی اور اقداری نہیں ہوتے'، (گوپی چند نارنگ)، 'منٹو کے افسانوں میں عورت'، 'عصمت چغتائی کے نسوانی کردار'، (وزیر آغا)، 'کارگہہ شیشہ گری'، 'غالب جہانِ دیگر'، 'اُردو افسانہ.....تجزیہ' (حامدی کاشمیری)، 'نصف صدی کی اُردو شاعری میں مابعد جدید کردار'، 'متن کی تانیثی قرأت'، 'اُردو کا مابعد جدید افسانہ' (قاضی افضال حسین)، 'قدیم شعری متن اور جدید تعبیری رویّے' (ابوالکلام قاسمی)، 'کڑوا تیل کا ردِ تشکیلی مطالعہ'، 'بیانہ عرصہ اور راجندر سنگھ بیدی'، (شافع قدوائی)، 'وزیر آغا کی غزل کا ساختیاتی مطالعہ' (فہیم اعظمی)، 'براؤننگ دی ڈاگ کا ساختیاتی مطالعہ' (اقبال فریدی)، 'صاحب کا فروٹ فارم کا ساختیاتی مطالعہ' (قاسم یعقوب)، 'سمندر کا بلاوا کا ساختیاتی مطالعہ' (ناصر عباس نیّر) وغیرہ مضامین سے اُردو میں ادب شناسی کا جو نیا میلان پروان چڑھ رہا ہے اُسے کسی بھی طرح کم اہمیت کا حامل قرار نہیں دیا جا سکتا ہے کیوں کہ اُردو کی عملی تنقید کے ذخیرے میں پہلی بار ایسے مضامین شامل ہوئے جو بیک وقت روایتی تحریروں سے مختلف بھی ہیں اور منفرد بھی۔

O

بنیادی سوال یہ ہے کہ اُردو تنقید کیوں اپنی رگوں میں نیا اور تازہ خون بھرنے کے لیے مغرب کے تنقیدی سرمایے ایک بے بس اور عاجز سائل کی طرح کشکول لے کر کھڑی ہے۔ یہ سوال ہر ذی حس اور کم ذی حس انسان کے لیے ہمیشہ اپنی تہذیبی اور تفکیری سرچشموں کی کم مائیگی کی وجہ سے مایوسی کا سبب بنتا آ رہا ہے۔ اُردو معاشرے ہی کا کیا مذکور، برصغیر ہنوز پوری طرح مجموعی طور پر نوآبادیاتی ہتھکنڈوں سے گلوخلاصی حاصل نہیں کر سکا،'' وجوہ بہر حال جو بھی ہوں، مگر اتنی بات تو بہر حال طے ہے کہ ہمارا معاشرہ مجموعی طور پر تقلیدی ہے نہ کہ اختراعی۔ یہاں کے علمی اور ادبی کارنامے ہمارے علم میں اضافے کا موجب تو بنتے ہیں مگر ہماری زندگی کے معیار کو بڑھانے یا عالمی سطح تک پہنچانے میں ہماری کوئی راہ نمائی نہیں کرتے۔ اس پل پل بدلنے والی دنیا میں اکثر و بیشتر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی کائنات کا یہ حصّہ کتنا قناعت پسند ہے کہ اسے جہدِ مسلسل کے آداب کی ہوا تک بھی نہیں لگی ہے۔''(۱) یہی وجہ ہے کہ ہم آئے دن سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں وقوع پذیر محیر العقول انکشافات اور ایجادات سے اپنی زندگی کو آسان اور پُر کیف بنانے کے لیے مغرب کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے رہتے ہیں۔ عصرِ حاضر کے ایک معتبر نقاد ناصر عباس نیّر نے مغرب سے ہمارے مستعارانہ رویّے پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> ہم جس طرح اپنی سائنسی و ٹکنالوجی، طبّی ضرورتوں کے لیے مغرب کے دست نگر ہیں اسی طرح فکر و نظر کے میدان میں بھی مغرب اس قدر ترقی یافتہ ہے کہ ہمیں اپنی ثقافتی و فکری ضرورتوں کا سامان مغرب سے مل جاتا ہے اور یہ صورت اُس وقت تک رہے گی جب تک مغربی کلامیوں میں ہمارے اہلِ علم شرکت نہیں کرتے اُن سے فکری مکالمہ ان پیراڈائم کے تحت نہیں کرتے جو مغرب نے تشکیل دیے ہیں!۔ یا ان کلامیوں کے متوازی کلامیے (Counter Discourses) تشکیل نہیں دیتے اور یہ اُس وقت تک ممکن نہیں جب نوآبادیاتی صورتِ حال، ذہنیت اور فضا سے آزادی حاصل نہیں کر لی جاتی۔(۲)

لیکن ہمارے ادبا کی ذہنی سطح کا حال بھی دیکھیے کہ جب وہ اُردو میں مابعد جدید تنقیدی نظریہ سازی کے بارے میں سوچتے اور لکھتے ہیں تو اُن کے افکار کی تان مغربی دانشوری کی تکذیب، تردید، تذلیل اور تحقیر پر ہی ٹوٹتی ہے۔ مثال کے طور پر عمران شاہد بھنڈر نے مورخہ ۳؍ مارچ ۲۰۱۳ء کو روزمانہ 'ایکسپریس' لاہور میں شائع ہونے والے مضمون بعنوان ''مابعد جدید اردو تنقید'' میں ''لاتشکیل'' کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہ مشرقی کلامیوں کو لامرکز کرنے اور استحصال زدہ طبقے کو مزید حاشیے پر دھکیلنے کے لیے دریدا نے پیش کیا ہے۔ اسی طرح فضیل جعفری نے اپنے مضمون ''امریکی شوگر ڈیڈی اور مابعد جدیدیت'' میں لکھا ہے کہ مابعد جدیدیت مغربی استعمار کی ایک سوچی سمجھی سازش ہے جو تیسری دنیا کے عوام کو سرِ نو ثقافتی سطح پر نوآبادیاتی چنگل میں پھنسانے کے لیے تیار کی جا رہی ہے۔ یہ اور اس طرح کئی اعتراضات کیے گئے ہیں۔ اِن معترضین کی فہرست میں شمیم حنفی، سلیم اختر، جمال پانی پتی، سراج منیر، تحسین فراقی جیسے دانشوروں کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

اس سلسلے میں کچھ اہم ناقدین کے اعتراضات اور خدشات سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس ضمن میں محمد حسن عسکری اور محمد علی صدیقی کے اسمائے گرامی اس اعتبار سے اہمیت کے حامل ہیں کہ انہوں نے سب سے پہلے ساختیات پر اعتراض کر کے نئے تنقیدی کلامیوں کا راستہ روکا۔ واضح رہے کہ ان کے اعتراضات کی بنیاد ان کے مخصوص آئیڈیالوجیکل موقف میں مضمر تھی۔ عسکری نے فرانس کے ایک نو وارد مسلمان محمد آرکون کو قرآن پاک کا مطالعہ ساختیات کی رُو سے کرنے کی تجویز یہ کہہ کر رد کی تھی

کہ نئے مغربی نظریات گمراہی کے دلدل کی طرف ہی راستہ دکھاتے ہیں۔اس طرح محمد علی صدیقی نے ساختیات کے خلاف اس وجہ سے محاذ کھولا کہ ساختیاتی تجزیہ زبان کے synchronic یعنی یک زمانی مطالعے پر مصُر تھی جب کہ مارکسزم کے پروردہ ترقی پسندوں کے تفکیری رویّوں کی اساس تاریخ کے لیل ونہار میں پوشیدہ تھی۔ان دو کے بعد اُردو میں وقتاً فوقتاً کئی لوگوں نے اعتراضات قائم کیے جن میں سے بیشتر نئے نظریات کے موئدین کی ذاتی زندگی کے اردگرد ہی گھومتے تھے اور روشن خیال ادبا کو ہر سطح پر یہ کہہ کر مذاق بنایا جارہا تھا کہ وہ مغرب کے چبائے ہوئے نوالوں کی طرف لپک رہے ہیں۔اُردو تک ہی کیا موقوف،خود برطانیہ کی کیمبرج یونیورسٹی میں ۱۹۸۰ء میں کولن میک لیب نام کے ایک استاد کو اس لیے نوکری سے رخصت کیا گیا کہ وہ ساختیات، پس ساختیات جیسے نظریات سے دلچسپی رکھتا تھا۔اس طرح اگر اُردو میں کسی شخص کو نئے نظریات سے فکری وابستگی کا مظاہرہ کرنے پر کسی بھی سطح پر طعن وتشنیع کا نشانہ بنایا جاتا ہے تو یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے۔بلکہ اُردو کے ایک معتبر استاد پروفیسر فضیل جعفری نے ''ساختیاتی کباب میں ردِتشکیل کی ہڈی'' اور ''امریکی شوگر ڈیڈی اور مابعد جدیدیت'' کے عنوان سے ذہنِ جدید میں مضامین لکھ کر نئے تنقیدی ڈسکورس کا مذاق اڑایا۔

آپ میں سے بیشتر کو یہ سنتے ہوئے حیرت ہوگی کہ اُردو میں تھیوری کی تفہیم اور توضیح سے لے کر اس کے اطلاق تک جتنی بھی تحریریں سامنے آئی ہیں اُس سے کہیں زیادہ منظّم اور منضبط انداز میں اس کی مخالفت میں یاروں نے اپنی ساری توانائی صرف کی ہے۔اسی لیے جب کوئی بھی شخص اُردو میں تھیوری کی تاریخ کے حوالے سے لکھنا چاہتا ہے تو بادلِ ناخواستہ ہی سہی اُسے معترضین کے خیالات واعتراضات کو بہرحال حیطۂ اظہار میں لانا ہی پڑتا ہے۔

O

جن کشادہ نظر ناقدین اور دانشوروں نے اسّی کی دہائی میں تھیوری پر مباحث قائم کیے اور اس کی تشریح وتوضیح اور تفہیم وتعبیر میں اپنی دیدہ وری کی روایت کا احترام کرتے ہوئے اور علمی وادبی بصیرت کا ثبوت دیتے ہوئے نہایت ہی شرح وبسط کے ساتھ مضامین کے انبار لگائے اور تین دہائیوں سے اُن کا یہ سفر بغیر کسی رکاوٹ کے جاری وساری ہے،ان کی ابتدائی اور تازہ تحریروں کے جائزے کے بعد تھیوری کے مستقبل کے بارے میں بہتر رائے قائم کی جاسکتی ہے۔فکشن اور شاعری دونوں میں مابعد جدید تنقیدی تھیوری کی بدولت نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں بلکہ مشرقی شعریات کے امتیازات اور بنیادی مقدمات کے سرمایے کی طرف ہمارا التفات بھی اس تھیوری کا ہی مرہونِ منت ہے۔قاضی افضال حسین نے مابعد جدیدیت کے ایک اہم عنصر' فوق بیانیہ کا استرداد' کے نتیجے میں ہماری اپنی تہذیبی وثقافتی روایات واقدار کی بازیافت کی کوششوں کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

> آفاقی اصولوں کی نفی کے نتیجے میں شعریات کے وہ اصول جو ابھی چند سال پہلے تک فرانس وامریکہ سے لے کر ہندوستان کی ہر زبان کے لیے موزون ومناسب تھے، بے معنی ہوگئے اور ادب کی معنویت خود اس زبان کی شعری روایت میں دریافت کی جانے لگی۔ مابعد جدیدیت کا اصل کارنامہ ہی یہ ہے کہ اس نے شعریات کے آفاقی تصور سے انکار کر کے مقامی شعریات کی اہمیت وفوقیت نمایاں کی۔اُردو میں مشرقی شعریات سے ہماری بڑھتی ہوئی دلچسپی آفاقی اصولوں یا فوق بیانیہ کے اسی انکار کا نتیجہ ہے۔(۳)

مابعد جدید تھیوری نے اُردو تنقید کو نئی زبان عطا کی جس کی اساس بین العلومی ہے۔اس نے نئی اصطلاحات کے ذریعے

تنقید کے مروجہ معانی و مفاہیم کو کامل استرداد عطا کر کے ایک بالکل نئے کلامیہ کا آغاز کیا۔ لاتشکیل، تشکیلی حقیقت، صوت مرکزیت، لا مرکزیت، معنی نما، تصورِ معنی، لوگومرکزیت، ساخت تشکیل، افتراق، التوا، ڈسکورس، ایپس ٹیم، ہائپر ریلیٹی، اکریوین، اکریونت، لانگ، پارول، متن، بیانیات، معنی کی تکثیریت، شعریات وغیرہ اصطلاحات نے اُردو تنقید کی آب جو کو بحرِ بیکراں میں منقلب کر دیا۔ اُردو کے مابعد جدید نظریاتی تنقید کے موجودہ سرمایے پر ایک سیر حاصل بحث یہاں پر اس لیے لازمی ہے تا کہ اس کے اور پس روتنقیدی اسلوب و انداز کے درمیان خطِ امتیاز کھینچا جا سکے۔ اس بات سے مابعد جدید تنقید کے معترضین بھی بخوبی واقف ہیں کہ مابعد جدید تھیوری نے اُردو کی نظریاتی تنقید کو نئی اصطلاحات، نئی تراکیب، نئے اسالیب اور نئی زبان عطا کیے، جس نے مجموعی طور پر تنقیدی نظام کو ہی نئی فضا سے معمور کر دیا۔

مابعد جدیدیت کی طرح اس کا تنقیدی نظام بھی بین العلومی مزاج کا متحمل ہے جس نے ایک طرف ادب فہمی کے مروجہ طریقہ کار کو معرضِ سوال میں کھڑا کر کے رکھ دیا ہے تو دوسری طرف سہل پسند ناقدین کے دائرہ کار کو محدود تر کر کے ان کی کایا پلٹ دی ہے۔ لیکن ان سب کے ساتھ ساتھ تھیوری کی جو سب سے بڑی دین ہے وہ مطالعے کا تکثیری طور ہے۔ جیکس دریدا کے فلسفہ لاتشکیل نے ادبی مطالعات کے جمود کو اس انداز سے توڑا کہ یہ بیسویں صدی کے ربع آخر میں ادب شناسی کا مہ کامل بن کر سامنے آیا۔ تکثیریت اس تھیوری کا محور و مرکز ہے جس کی وجہ سے معنی کی وحدت پارہ پارہ ہو کر رہ گئی اور ان حضرات کے افکار کو از کارِ رفتہ قرار دیا جو کسی مخصوص مکتبۂ فکر کے تحت اخذِ معنی کے تفاعل میں سرگرمی دکھاتے تھے۔ یہ تکثیریت خالص مغربی نہیں ہے بلکہ ہمارے متقدمین نے بھی معنی کی وحدت کے برخلاف اس کی کثرت پر زور دیا ہے۔ شہنشاہِ غزل میر تقی میرؔ کا مندرجہ ذیل شعر اس سمت میں راہ نمائی کا کام انجام دے سکتا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

طرفیں رکھے ہے ایک سخن چار چار میرؔ
کیا کیا کہا کریں ہیں زبانِ قلم سے ہم

اسی وجہ سے ہم یہاں پر یہ کہنے میں حق بہ جانب ہیں کہ تھیوری کا مستقبل ہماری کلاسیکی شعریات کے تنوع سے مشروط ہے۔ جب ہم تھیوری کے نظریاتی اور اطلاقی پہلوؤں پر لکھیں گے تو اُردو کے تنقیدی سرمائے کی بازیافت اس کا اولین فریضہ ہوگا۔

اُردو میں تھیوری کی کارفرمائی کے حوالے سے یہ کہنا بے جا نہیں ہوگا کہ مستقبل میں اس برگ و بار لانے کے زیادہ سے زیادہ امکانات ہیں۔ وہ اس لیے نہیں کہا جا رہا ہے کہ جن لوگوں نے اس کو اُردو میں رواج دینے اور ادبی ڈسکورس کا حصّہ بنانے میں اپنی بساط بھر کوششیں کیں بلکہ اس کے معترضین نے بھی وقت وقت پر بادلِ ناخواستہ ہی سہی اس کی معنویت، ضرورت اور اہمیت کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا ہے۔ اُردو میں مغربی نظریاتِ نقد کے معترضین میں شمس الرحمٰن فاروقی کئی دہائیوں سے نمایاں ہیں اور ادب شناسی کے حوالے سے اُن کے افکار کے حوالے جا بجا دیے جاتے ہیں۔ لیکن اُن کے معتقدین میں شاذ ہی کسی کو یہ معلوم ہے کہ (ساحری، شاہی اور صاحب قرانی) داستانِ امیر حمزہ کا مطالعہ: (نظری مباحث، جلد اول)، شعر شور انگیز، تفہیمِ غالب جیسی تصانیف میں شامل مباحث روسی ہیئت پسندی، ساختیات اور تفہیمیات کی روشنی میں پیش کیے گئے ہیں۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ انہوں نے خود زیرِ لب تھیوری کے حوالے سے جو بیانات دیے ہیں اُن سے مستقبل میں تھیوری کی شیرازہ بندی کرنے میں مدد ملے گی۔ شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں:

میرا کہنا یہ ہے کہ روسی ہیئت پسندی(Russian Formalizm)اور بیانیہ کی فرانسیسی وضعیاتی تنقید سے معاملہ کیے بغیر ہم ناول اور داستان دونوں کی تنقید میں ناکام رہیں گے۔(۴)

تھیوری کے دائرہ کار میں صرف مابعد جدید دور میں تخلیق کیے گئے متون کو ہی نہیں رکھا جا سکتا ہے بلکہ ماقبل کے ادبی اظہارات کو بھی بجا طور پر اس کے ذریعے جانچا اور پرکھا جا سکتا ہے۔ادب پارہ اپنے خود مکتفی کردار کی بنیاد پر کسی بھی نظریے سے آنکھیں چار کرنے کی تب وتاب سے معمور ہوتا ہے اور اس کی دائمیت ہی اس کا حسن اور اس کی اہم قدر ہے۔ مابعد جدید تھیوری کے تحت بین المتونیت، قاری اساس تنقید، امتزاجی تنقید، اکتشافی تنقید جیسے نظریات کا اطلاق ہر دور کے ادب پر یکساں طور پر کیا جا سکتا ہے اور یہی اس کے مستقبل بین ہونے کا خوب صورت عندیہ دیتا ہے۔ممتاز ادیب اور نقاد ابوالکلام قاسمی مابعد جدید تنقید کے طریقہ کار کے دائرہ کا تعین کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> مابعد جدید تنقید صرف، مابعد جدیدیت، زیرِ اثر لکھے جانے والے ادب پر ہی نہیں لکھی جائے گی۔اگر ایسا ہوتو کسی بھی تنقیدی طریقہ کار کا دائرہ محدود ہو کر رہ جائے گا اور آج کے بدلے ہوئے ادبی منظر نامے میں ماقبل کے متون کے مطالعہ کا جواز، اور معنویت برائے نام رہ جائے گی۔کسی بھی زمانے کے تنقیدی اصول وضوابط جس طرح اپنے زمانے کے ادبی رویّوں سے کسبِ فیض کرتے ہیں لیکن ان کا اطلاقی پہلو زمانۂ حال کے ادب تک محدود نہیں رہتا اسی طرح مابعد جدید تنقید کو بھی قطعیت سے اجتناب کرتے ہوئے اپنے مطالعے اور تفہیم کا دائرہ وسیع کرنا ہوگا۔(۵)

مذکوہ اقتباس میں ابوالکلام قاسمی نے تھیوری کو بااثر اور بامعنی بنانے کی جو بات کہی ہے اُس نے آج یقیناً اپنا دائرہ وسیع کیا ہے جس کا ثبوت تھیوری کے تحت پیش کیے گئے حالیہ مطالعات سے سامنے آتا ہے۔

یہاں پر ایک بات کا اظہار کرنا چاہوں گا کہ جس نے بھی نئے افکار کی تازگی سے اپنے ذہن کو معطر کیا، اُس کی تحریر کا رنگ سرے سے ہی بدل گیا کیوں کہ اس کی سوچ میں مشرقی اور مغربی افکار کے رنگا رنگ دھاگے اور ریشے کا ایک نیا اور منفرد عکس تیار ہوا۔ہاں یہ بھی صحیح ہے کہ ادب پنپتا اور پروان چڑھتا ہے اختلافِ رائے سے، یہی اختلاف بحث ومباحثہ کو راہ دے کر نئے کلامیوں کی تفہیم وتعبیر میں مناسب حد تک مدد کرتا ہے۔بقولِ ذوق ؎

گلہائے رنگ رنگ سے ہے رونقِ چمن
اے ذوق! اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

لیکن اس کے لیے بنیادی شرط یہ ہے کہ اختلاف علمی ہو، ادبی ہو اور تعقلاتی ہو۔

خلاصۂ بحث یہ کہ مابعد جدید تھیوری نے ادب کے تفہیم وتجزیے کا جو طور سامنے لایا وہ اپنی اصل میں فارمولا سازی اور تصوراتی گُلیوں کے استرداد کا سامان اپنے جلو میں رکھتا ہے جس نے یقینی طور پر تفہیمات وتعبیرات کی ایک نئی دنیا خلق کی ہے۔ ادب کو نئے بلکہ اَن گنت تناظرات میں پڑھنے کی طرح ڈالی۔اس طرح فی زمانہ ادب کی تخلیق سے لے کر اس کی قرأت تک تنقیدی کلامیے نے جو بنیادی نوعیت کے سوالات قائم کیے ہیں، اُن سے ہی تھیوری کے روشن مستقبل کی ضمانت دی جا سکتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ اداریہ، سالانہ ادبی تحقیقی وتنقیدی مجلّہ 'ترسیل' نظامت فاصلاتی تعلیم، کشمیر یونیورسٹی، سری نگر، شمارہ ۱۱، سال ۲۰۱۳ء

۲۔ ناصر عباس نیّر، جدید اُردو تنقید پر مغربی اثرات، شعبہ اُردو، بہاوالدین ذکریا یونیورسٹی، ملتان پاکستان، ص ۲۸۲

۳۔ نصف صدی کی اُردو شاعری میں مابعد جدید عناصر، مشمولہ تحریر اساس تنقید، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۰۹ء، ص ۱۹۰

۴۔ ساحری، شاہی، صاحب قرآنی، داستانِ امیرِ حمزہ کا مطالعہ، جلد اول، ص ۱۷

۵۔ ابوالکلام قاسمی، معاصر تنقیدی رویّے، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۰۷ء، ص ۵۱